نمرتا

احمد عبّاس حسینی

97-1، مرادی روڈ، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025، موبائل:9718747388

نمرتا کا پتی آج چار سال سے غائب تھا۔

پتہ نہیں آسمان نگل گیا یا زمین کھا گئی۔ کچھ پتہ نہیں چلا۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی گئی۔ اخبارات میں اشتہارات دیے گئے، رشتہ داروں کو خبر کی گئی مگر لاحاصل۔ ماں روتے روتے تھک گئی، باپ اِدھر اُدھر دوڑتے دوڑتے پریشان اور بے چاری نمرتا حیران، اس کے چہرے سے چلی گئی تھی مسکان۔ اس پر تو جیسے بجلی گر گئی۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئیں۔ حسین سپنے ٹوٹے ہوئے شیشہ کی طرح کرچی کرچی ہو گئے۔ اس کا سکون ختم ہو گیا تھا۔ وہ بھربھری مٹی کی طرح بکھر گئی۔ رات رات بھر جاگ کر وہ پرکاش کا انتظار کرتی رہی جیسے وہ ابھی دروازے پر دستک دے گا مگر وہاں کچھ نہ تھا سوائے اذیت ناک و کربناک رات، وحشت اور سنسان بھری رات، بڑی ہی تکلیف کی علامت تھی وہ رات۔

نمرتا کو میں بچپن سے جانتا تھا بلکہ یوں کہوں کہ وہ میری گود میں کھیلی تو غلط نہ ہوگا، بلکہ یوں کہوں کہ وہ میری گود میں کھیلی تو غلط نہ ہوگا کیونکہ اس کے والدین ہمارے پڑوسی تھے۔ جب وہ پیدا ہوئی تو اس کے ماں باپ نے بے حد خوشی منائی کیونکہ وہ اپنے ماں باپ کی محبت کی پہلی نشانی تھی۔ نمرتا کی پرورش اس کے والدین نے بے حد لاڈ و پیار سے کیا۔ میری چھوٹی بیٹی کامنی کی وہ ہم عمر تھی لہٰذا زیادہ تر وہ میرے گھر میں کامنی کے ساتھ کھیلا کرتی۔ گڑیا گڈے کا کھیل، اسکول کا ہوم ورک دونوں ساتھ ساتھ کرتیں۔ وقت گزرتا رہا اور وہ کھپریل پر چڑھی بیل کی طرح بڑھتی رہی۔ والدین نے تعلیمی زیور سے آراستہ کیا۔ لڑکیاں تو دوسرے کی امانت ہوتی ہیں۔ سن بلوغ تک ماں باپ بچی کی ہر خوشی اور ہر خواہش کا خیال رکھتے ہیں اور اسے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نمرتا بھی جب اس عمر میں داخل ہوئی تو والدین نے ایک دن اس کے ہاتھ پیلے کر دیے۔ وہ بہت خوش تھی۔ محبت کرنے والا پتی اور پیار کرنے والا گھرانا۔ سسرال میں اس نے دو ہستیوں سے ٹوٹ کر محبت کی ایک ساس دوسرے پرکاش سے۔

شادی کا ایک سال گزرا۔ کتنے جوش و خروش سے ان دونوں نے اپنا پہلا میرج ڈے منایا۔ نمرتا اس دن بہت خوش تھی۔ خود کو خوب سجایا، بنارسی ساڑی پہنی۔ دونوں ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں ڈالیں اور سیاہ بالوں میں ساؤتھ انڈین لڑکیوں کی طرح پھولوں کا موٹا سا گجرا باندھا تا کہ اس کی مہک سے پرکاش اس کی محبت میں جکڑا رہے۔ وہ عجیب دلکش پاکیزہ خوشبو تھی روح میں بالیدگی پیدا کرنے والی۔ کچھ دنوں کے لیے پرکاش کو آفس کی طرف سے مسوری جانا پڑا تو نمرتا بھی ساتھ ہو گئی۔ دہرادون سے بس میں جب مسوری کی طرف بڑھی تو وہ مسوری کی پیچ دار سڑک اور وہاں کے قدرتی مناظر کو دیکھ کر کچھ کھو سی گئی۔ ہر طرف سبز پہاڑیوں نے اس کا استقبال کیا۔ پہاڑوں سے ٹکرا کر آنے والی سرد ہوائیں، پھلوں کے بوجھ سے لدے ہوئے درختوں کے جھنڈ اور پھولوں کی مختلف خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اس کے خوبصورت چہرے پر خوشی کے آثار تھے۔ پرکاش اس کے جذبات کو خوب سمجھ رہا تھا۔ راستہ ہنسی خوشی میں گزرا۔ خوب باتیں کرتے، ہنستے بولتے، ہاتھوں میں ہاتھ دونوں مسوری پہنچ گئے۔ وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ پرکاش اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا اور وہ ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھ کر وہاں کے حسین نظاروں میں غرق ہو گئی۔ سڑکوں پر خوب رونق تھی۔ حسین جوڑے، خوبصور عورت ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے گول مٹول بچے، بے فکر نوجوانوں کی ٹولیاں، ہر زبان کے لوگ، ہر طرح کے کپڑے میں ملبوس، ہر رنگ کے لوگ گویا پورا ہندوستان اسی بازار میں سمٹ گیا۔ بالکونی سے وہاں کے بازار کا ہجوم دیکھتی رہی۔ اسی بازار میں اسے ایک مندر دکھائی دیا۔ مندر کو دیکھتے ہی اسے دہلی کے رنگ روڈ پر بنے اکشر دھام مندر کی یاد آ گئی جہاں وہ شادی سے پہلے اپنے انکل کے ساتھ ہر منگل کو جاتی تھی۔ شام کے وقت جب پوجا شروع ہوتی تو وہاں لوگ عقیدت سے جمع ہوتے اور بھگوان کا پرشاد لینے کے لیے مورتی کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتے۔ سڑک پر کچھ دیر کے لیے خاموشی رہی پھر ایک ٹرک شور مچاتا ہوا گزرا اور سڑک و بالکونی میں اس کی روشنی پھیل گئی۔ نمرتا ان لمحات میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک اسے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ رکھنے کا احساس ہوا۔ اس نے نظریں گھما کر دیکھا۔ سامنے پرکاش کھڑا مسکرا رہا تھا۔ نمرتا کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ کی قوس قزح بکھری تو گالوں پر ننھے ننھے گڈھے پڑنے لگے۔ اس نے ایک پیکٹ نمرتا کی طرف بڑھایا—

''ذرا کھولو اسے—''

''یہ روز روز کیا لاتے ہیں—''

''اچھا جلدی سے کھولو۔ اس میں جو ساڑی پسند آئے، اسے پہن کر دکھاؤ—''اس نے پیکٹ کھولا۔ اس میں تین ساڑیاں تھیں—

''آپ کی پسند تو بہت اچھی ہے—''

''جی ہاں—اگر اچھی نہ ہوتی تو آپ کو کیسے پسند کرتا—''

دونوں کمرے میں گئے۔ اس وقت ہوٹل کے بیرے نے دو کپ کافی لا کر دی اور دونوں اسی میں کھو گئے۔ کچھ دیر بعد نمرتا نے پیار سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''تم تھک گئے ہو، سونا چاہتے ہو—''

''ہاں، میں سمجھتا ہوں کہ مجھے کچھ آرام کی ضرورت ہے—''اور پھر دونوں بستر پر چلے گئے۔ کبھی کبھی زیادہ تھکاوٹ سے نیند اُڑ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ نیند کو کیا آنا تھا، اس کی آنکھوں کے سامنے دن کا پورا نظارہ گھوم رہا تھا۔

وہ بچپن ہی سے بہت حساس تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی وہ زیادہ تر خاموش رہتی، صرف اپنے کام میں مشغول دن بھر بھائی بہن آپس میں ہنستے کھیلتے۔ ماں گھر سنبھالتی یا پھر کچن کا کام اس کے سر پر ڈال کر محلّہ میں گھومنے چلی جاتی۔ شام کو باپ جب کلینک سے گھر میں داخل ہوتا تو پورے گھر میں سناٹا طاری ہو جاتا۔ قبرستان کی سی ہیبت پورے گھر پر چھا جاتی۔ وہ خاموش کچن میں گھس کر ماں کا ہاتھ بٹاتی یا پھر اپنے کمرے میں جا کر بستر پر آرام کرتی لیکن لڑکیوں کی قسمت میں آرام کہاں۔ ماں کی آواز سنائی دیتی۔

''نمرتا، ذرا باپ کو پانی اور چائے دے دو—''

ہوا میں ایک تازگی اور عجیب سی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ مسوری سے چلتے وقت اس نے محسوس کیا۔ مسوری سے آنے کے بعد وہ اپنے گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ ساس سسر کی خدمت نمرتا کا اوّلین فرض تھا۔ دیور دن رات محنت سے اپنی تعلیم میں لگا تھا۔ اس کے خلوص، اخلاق اور شرافت کا کچھ ہی دنوں میں نمرتا پر اثر ہونے لگا۔ پرکاش اپنی نوکری پر دہلی میں تھا۔ روزانہ فون پر خیریت معلوم ہوتی۔ گھر کے سارے کام سے فارغ ہو کر شب میں بستر پر جب لیٹتی تو موبائل پر پرکاش سے باتیں کرنے لگتی۔ ایک بار کچھ دنوں کی چھٹی لے کر پرکاش گھر آیا۔ وہ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ اس نے پرکاش کے لیے مختلف قسم کے ذائقہ دار پکوان پکائے۔ وہ ہمہ وقت اُس کے آس پاس رہتی، لیکن پرکاش اپنے کاموں میں اس قدر مشغول تھا کہ اسے نمرتا کے جذبات کا احساس نہ ہوتا۔ بیوی کے گلابی و نازک ہلتے ہوئے ہونٹ، شوہر کی محبت بھری آغوش میں سمانے کے لیے بے قرار تھے مگر پرکاش کبھی نمرتا پر زیادہ دھیان نہ دیتا۔ وہ تو کسی پلان، بزنس کے داؤ پیچ میں الجھا رہتا پتنی کی مسکراہٹ یا اس کی چاہت پر کبھی غور نہیں کرتا۔ اس کی آنکھوں کے سرخ ڈوروں کو دیکھتا ہی نہیں اور نہ اس کے جذبات پر کوئی قدم اُٹھاتا۔ نمرتا اُداس ہو کر دوسری جانب دیکھنے لگتی جدھر اندھیرے نے اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ ایک دن وہ واپس دہلی چلا گیا۔ ایک ہفتہ گزرنے کے بعد دہلی سے پرکاش نے اسے خبر دی کہ اس اپنے آفس کی طرف سے جمشید پور جانا ہے۔

''اتنی دور—''وہ فون پر ہی گھبرا گئی۔

''دیکھو یہ شہر بھارت میں ہی ہے۔ یہاں سے باہر نہیں—''

''مگر ہے تو دور—''

میں آخری سانس تک تمھارا انتظار کروں گی۔''چلتے چلتے اس نے پرکاش سے التجا کی—''

''دیکھو اپنا سفر طویل نہ کرنا—''اس کی آواز رندھ گئی۔

وہ جمشید پور پہنچ کر بھی نمرتا کے دلوں کے قریب تھا۔ پرکاش کی میٹھی آواز سن کر وہ مدہوش ہو جاتی تھی۔ اس کے پیار بھرے جملے گھنٹوں اس کی سماعت سے ٹکراتے اور وہ اس آواز کی شیرینی میں کھوئی رہتی۔ کچھ دنوں تک برابر فون آتے رہے اس کے بعد اچانک فون آنا بند ہو گیا۔ وہ پریشان ہو اُٹھی۔ بار بار فون کرتی مگر کوئی فون اُٹھاتا نہیں۔ فون بالکل خاموش تھا۔ اس کی عقل ماؤف ہو چکی تھی۔ ذہن بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ اس نے جمشید پور آفس سے رابطہ قائم کیا مگر وہاں سے بھی کوئی تسلّی بخش جواب نہ ملا۔ اسے بے حد گھبراہٹ ہو رہی تھی ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ وہ چیخنا چاہ رہی تھی مگر اس کی آواز باہر نہیں نکل رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ زندگی یوں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ ایک انہونی جب اس کے ساتھ ہوئی تو وہ بکھر گئی، ٹوٹ گئی اور سوچتی رہی کہ کاش وہ لمحہ اس کی زندگی میں نہ آتا۔ وہ رفاقتوں کی آنچ میں پگھلتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ زندگی کی مایوسیوں اور محرومیوں کے بارے میں۔ کتنی جلدی وہ پرکاش سے بچھڑ گئی، اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ ان خوابوں کے بارے میں سوچ رہی تھی جو محض خواب ہی رہے۔ حقیقت نہ بن سکے۔ وقت نے زندگی کو توڑ دیا۔ قسمت نے کتنا بڑا مذاق کیا تھا اس سے۔ پرکاش کہاں تھا اور کیوں دھوکہ دے کر چلا گیا:

آہستہ آہستہ وقت گزرنے لگا۔ پولیس خاموش ہو گئی لوگوں نے اس عظیم سانحہ کو بھلا دیا۔ مگر وہ کبھی کبھی جب یاد کرتی تو تڑپ اُٹھی۔ ایک دن ساس نے کہا۔

''پرکاش کا تو کچھ پتہ نہیں۔ بھگوان جانے وہ کہاں گیا مگر مجھ پر اس قدر بوجھ ڈالا کہ مجھ سے اُٹھا نہیں جاتا۔ اگر تم مناسب سمجھو تو تم میری بیٹی بن کر میرے ساتھ رہو—''وہ کچھ نہ بولی۔ پلکوں کے گوشے گیلے ہونے کو آئے تو اس نے ہاتھوں سے رگڑ ڈالے اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ بند کر کے بستر پر گر پڑی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا

فیصلہ کرے، اپنے والدین کے گھر میں بھی وہ خود کو ایڈجسٹ کر سکتی تھی۔ سوچ سوچ کر جب دماغ کی نسیں پھٹنے لگیں تب اس کا دل ساس کے ساتھ رہنے کے لیے راضی ہو گیا۔ بہت دیر تک آنکھیں موندے لیٹی رہی۔ ایک عجیب سی افسردگی کا احساس اس کے دماغ پر چھایا تھا۔ دل کو بہلانے کے لیے ایک اسکول کو جوائن کر لیا۔ صبح سے شام تک کے لیے خود کو بزی کر لیا تا کہ اس طرح اس کے ذہن کے نقوش سے پرکاش کی تصویر مٹ جائے۔ وہ اپنے خوابوں کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر زندگی بسر تو کر رہی تھی مگر اس کی آنکھوں میں نہ تو کاجل تھا نہ سپنا۔ لوگ اس کے دل کا کرب اس کے چہرے سے پڑھ سکتے تھے۔

وقت نے ایک انگڑائی لی۔

وہ ساس کے ہمراہ رہنے لگی۔ کبھی کبھی اسکول کی لمبی تعطیل میں اپنے والدین سے ملنے کے لیے چلی جاتی۔ والدین اس کی تنہائی کو دیکھ کر تڑپ اُٹھتے۔ باپ اس کی بے چارگی پر خاموشی سے آنسو بہاتا اور زبان سے دلجوئی کرتا۔ نمرتا اس کی کمزوری کو سمجھ رہی تھی مگر زبان سے اپنی دلی کیفیت بیان کرنے سے لاچار تھی۔ اب وہ ساس کے ساتھ رہنے کی عادی ہو رہی تھی پھر بھی کسی فنکشن یا پروگرام میں کسی جوڑے کو دیکھتی تو اس کے دل پر ایک چوٹ سی لگتی۔ اسے محسوس ہوتا جیسے دماغ پر کسی نے ہتھوڑے سے مارا ہو۔ فنکشن کا شور برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اسے دبانا چاہا۔ شاید سکون آ جائے مگر ناممکن— دل کو سکون نہیں ملا، مجبوراً گھر بھاگ آ گئی۔

''میں اب کسی فنکشن میں شریک نہیں ہوں گی—'' گھر میں داخل ہوتے ہی وہ بڑبڑائی—

''کیا ہوا بیٹا، وہاں تم سے کسی نے کچھ کہہ دیا—''

نہیں۔ نہیں۔ کسی نے کچھ نہیں کہا— لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا۔ سبھی اپنی رنگینیوں میں لطف اُٹھائیں اور میں تنہا کنارے بیٹھ کر خاموشی سے ان کا تماشہ دیکھوں—''

''بیٹا، ایک سوال کروں—''

''بولیے—''

''کیا میں تمھاری دوسری شادی کر دوں— ماں نے دھیرے سے دریافت کیا۔

''کیا— یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آج چار سال سے بہاریں مجھ سے روٹھی ہیں، خوشیاں مجھ سے دور ہیں، کوئی نغمہ مجھے سنائی نہیں دیتا تو آج آپ میرے دل کے تاروں اور اس کے خوابوں کو جگانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اب میں کسی دوسرے مرد کو اپنا پیار دے پاؤں گی یا نہیں، بتا نہیں سکتی—''

''بیٹا نمرتا، تم یہ مت سمجھنا کہ میں تمھاری ذمہ داری سے گھبرا گئی ہوں۔ اس گھر کے دروازے تمھارے لیے ہمیشہ کھلے ہیں—''

''آپ میرے والدین کے بعد مجھے سہارا دینے والی ہیں۔ میں تو آپ کے لیے کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ کا احسان میں چکا بھی نہیں سکتی بلکہ آپ کی دی ہوئی تعلیم میرے لیے مشعل راہ اور زندگی کا سرمایہ ہے میری تو خواہش تھی کہ میں اسی گھر کے کسی کونہ میں پڑی رہوں اور آپ کی سیوا کروں لیکن آپ نے تو آج عجیب بات کہہ دی—''

''نہیں۔ نہیں۔ میں تیری زندگی کو خوبصورت بنانا چاہتی ہوں تا کہ تو بھی ایک نئی خوشحال زندگی گزار سکے۔ چار سال تو تو نے افسردگی میں بسر کیا۔ تمھاری آنکھوں میں سپنے ہوں گے۔ میں تم سے سپنے دیکھنے کا حق کیوں چھین لوں۔ تم ان سپنوں پر بیٹھے پہرے کو ہٹا دو—'' ٹپ ٹپ آنسو ساس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔

''نہیں۔ نہیں اب آپ مجھے دعائیں دیں تا کہ آئندہ کی زندگی سکون سے بسر کروں—'' وہ دوڑ کر ساس کے گلے لگ کر رونے لگی۔

اچانک پڑوس کے مندر سے گھنٹی بجنے کی آواز پر نمرتا نے اپنے سارے آنسوؤں کو جمع کیا اور اپنے لمحہ بکھرے، زخمی وجود کو سمیٹا۔ شکر ہے وہ ٹوٹ کر زیادہ بکھر نہ پائی۔ اس نے دل مضبوط کیا۔ وہ تو ہمیشہ حالات سے مردانہ وار لڑتی رہی۔ آج کیسے سپر ڈال دیتی۔ کچھ دیر کے بعد ساس کو بتا کر وہ اپنے گھر کے لیے نکلی۔ سارا راستہ اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا کہ گھر جا کر والدین سے کیا کہے گی۔ کن الفاظ سے بات شروع کرے گی۔ بابا کا سامنا کس طرح کرے گی اور پھر وہ لمحہ آ گیا جب وہ گھر پہنچ گئی۔ بابا جہاندیدہ آدمی تھے انھیں بیٹی کا یوں اچانک پہنچنا کچھ عجیب سا لگا۔

''نمرتا بیٹی سب خیریت تو ہے—''

''ہاں، بابا سب خیریت ہے۔ کہو تو واپس چلی جاؤں—'' بے حد پھیکی سی ہنسی اس کے چہرے پر آئی۔

''بابا ایک بات پوچھوں—''

''آج چار سال گزر گئے۔ آپ لوگوں نے کبھی میرے دل کی کیفیت کا پتہ لگایا۔ کبھی میرے جذبات کو محسوس کیا۔ شادی کر کے آپ لوگ خاموش ہو گئے۔ پرکاش کے ہمراہ میں جتنے دن رہی، میری زندگی کا وہ ایک سنہرا دور تھا۔ ایک ایسا وقت جسے میں فراموش نہیں کر سکتی، لیکن یہ میری بدقسمتی ہے کہ پرکاش میرے ہمراہ زیادہ نہ رہا۔ وہ کہاں گیا، کیوں گیا، اس کے ساتھ کیا ہوا۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ آج تک یہ تجسس برقرار ہے۔ آج میری ساس میری دوسری شادی کرنا چاہ رہی ہیں۔ ان کا مشورہ میں کیسے قبول کر لوں میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ اپنے دل کے آئینہ میں پرکاش کی جگہ کسی دوسرے مرد کو رکھ دوں یہ کیسے ممکن ہے—''

''لیکن بیٹا، ذرا سوچو۔ آج تمھاری ساس ہے۔ کل کوئی دوسرا دن

آجائے یعنی تمھارے دیور کی شادی ہوجائے اور اس کی بیوی تمھیں پسند نہ کرے تو اس وقت تم کیا کروگی۔نہیں۔نہیں بیٹا۔نہیں تمھاری ساس نے ایک نیک مشورہ دیا ہے۔تمھیں اب اپنی زندگی بدل دینی چاہیے اور اپنے مستقبل کو خوبصورت بنانے کی کوشش کرنی چاہیے—'' اماں نے اسے لپٹا کر اپنی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو بہاڈالے۔

باپ کے مشورے پر وہ خاموش ہوگئی۔خوش قسمتی سے جلدی ہی اسے یہاں بھی ایک کالج میں ملازمت مل گئی۔وہ ایک ذہین طالبہ تھی۔کالج کا پہلا دن تھا۔اسے سکنڈ فلور پر کلاس لینا تھی۔وہ بہت تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی وہ زور سے کسی سے ٹکرائی۔ٹکرانے والے کو اس نے بھنا کر دیکھا۔سامنے پروفیسر کھنّہ تھے جن کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھری تھی۔

''میڈم ذرا راستہ دیکھ کر چلیں ورنہ کوئی عظیم سانحہ ہوسکتا ہے—''

''اب کیا سانحہ ہوگا۔میری زندگی میں تو سانحہ ہو چکا—''اس نے سوچا اور کلاس روم میں چلی گئی۔

کلاس لے کر اسٹاف روم میں بیٹھ گئی۔دو چار اساتذہ سے تعارف ہوا اسی بیچ پروفیسر کھنّہ اسٹاف روم میں داخل ہوئے۔اس نے شرمندگی سے نظریں جھکالیں—

''آپ نے کون سا سبجیکٹ لیا ہے۔''پروفیسر کھنّہ نے خاموشی کا تالا توڑا۔

''ہسٹری—''

''واہ۔تب تو آپ کو محبت کی نشانی تاج محل کے بارے میں گہرا مطالعہ ہوگا—''وہ مسکرا دی۔تاریخی داستان سے گفتگو شروع ہوئی اور دھیرے دھیرے ذاتی مسئلہ پر باتیں شروع ہوگئیں۔اس نے پرکاش سے شادی اور پھر اس سے بچھڑنے کی پوری داستان سناڈالی۔

میڈم مجھے آپ کی بابت جان کر بے حد افسوس ہوا مگر آپ نے ہمت سے ان حالات کا جس طرح مقابلہ کیا، وہ تعریف کے قابل ہے—وہ بہت غور سے انھیں دیکھ رہی تھی۔پروفیسر کھنّہ کے چہرے پر ایک کرب تھا۔

''میری کہانی بھی آپ سے ملتی جلتی ہے۔ماں باپ نے سریتا سے میری شادی کی۔چھ ماہ تک زندگی اچھی گزری۔پھر دھیرے دھیرے گھر کے نظام میں تبدیلی شروع ہوگئی۔بات بات پر آپس میں نوک جھونک شروع ہوگئی۔اس کے مزاج میں تلخی پیدا ہونے لگی۔شادی سے قبل وہ کسی لڑکے کی محبت میں گرفتار تھی۔آہستہ آہستہ اختلاف کی دیوار بلند ہونے لگی۔ایک دن وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔میں نے اِدھر اُدھر تلاش کیا مگر کوئی سراغ نہ ملا۔دس دن بعد آئی اور طلاق نامہ دے کر چلی گئی۔میں خاموشی سے اس کا چہرہ تکتا رہا۔اس دن میں کافی ٹینشن میں تھا اور آج اُسی اذیت کو جھیل رہا ہوں۔

گھر میں آکر وہ آنکھیں موند کر اپنے بستر پر گر گئی۔ماں نے محبت سے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس نے پروفیسر کھنّہ کی پوری کہانی سناڈالی۔

''بیٹا کوئی فیصلہ عجلت میں نہ لینا—زمانے کا رنگ اچھا نہیں۔انسان کب اور کس وقت ارادہ ترک کردے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ایک بار دھوکہ مل چکا ہے۔اب دھوکہ اُٹھانے کی سکت ہم میں نہیں۔''

ماں نے اپنی کیفیت کا اظہار کیا۔

دھیرے دھیرے کالج کے ماحول میں نمرتا خود کو ڈھالنے لگی۔اب اس میں کچھ تبدیلی رونما ہونے لگی۔خاتون اساتذہ سے گہرے مراسم ہونے لگے۔روزانہ کسی نہ کسی نئے موضوع پر خیالات کا تبادلہ ہوتا تھا۔پروفیسر کھنّہ بھی اس کی قربت چاہنے لگے۔وہ ان کے دل و دماغ پر بری طرح چھا چکی تھی۔پہلی بار وہ کسی سے اتنا متاثر ہوئے تھے۔سوتے جاگتے اسی کا خواب دیکھنے لگے۔دوپہر کا وقت تھا۔سبھی اساتذہ کینٹین میں پہنچ کرنے گئی تھیں۔اس دن پروفیسر کھنّہ اور نمرتا اسٹاف روم میں تنہا بیٹھے تھے۔وہ اسے سرد نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔اچانک پروفیسر کھنّہ اپنی کرسی سے اُٹھ کر نمرتا کی بغل والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''میرے اور آپ کے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں جس کے ذریعہ کچھ بولنے کی جرأت کروں مگر پھر بھی میں اپنے دل کی کیفیت آپ پر ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔کیا ہم لوگوں کے درمیان کوئی ایسا رشتہ ہوسکتا ہے جو سماج میں سراہا جائے—''

''کون سا رشتہ اپنانا چاہتے ہیں—''

''جنم جنم کا—''انھوں نے برجستہ جواب دیا۔

دیکھیے پروفیسر میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں ایک بار دھوکہ کھا چکی ہوں، اب دوسرا دھوکہ کھانے کی تاب مجھ میں نہیں۔میرا شاندار مستقبل اب اندھیرے میں ڈوب گیا۔

''میں اسی اندھیرے سے آپ کو نکالنا چاہتا ہوں۔میں نے آپ کو اپنانے کا عزم کرلیا ہے۔''

وہ دونوں نہ جانے کتنی دیر وہیں بیٹھے حالات کے تانے بانے میں الجھے رہے۔نمرتا بھی اپنے خیالوں میں کھوئی رہی۔اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور چلے گئے۔کمرے میں ایک سکوت طاری تھا۔اچانک پروفیسر کھنّہ کرسی پر زور دے کر اُٹھنا چاہ رہے تھے تو نمرتا کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر آ گیا۔نمرتا کے ہاتھ کی گرمی سے وہ پگھلنے لگے۔کھنّہ نے دیکھا وہ پہلے سے کہیں زیادہ عظیم اور خوبرو لگ رہی تھی۔اس کی پلکیں جھکی تھیں۔انھوں نے جھک کر اس کی پیشانی پر اپنی محبت کی مہر ثبت کردی۔

○○